GUMAN
ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154

Volume.7, Issue.2 (2024)
(April-June)

GUMAN
ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154

The Concept of Time in Khalida Hussain's Short Stories: An Analytical Study

خالدہ حسین کے افسانوں میں وقت کا تصور: تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر پرویز اختر نعیم

ڈاکٹر عبدالستار ملک

لیکچرار اردو، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج چک جھمرہ، فیصل آباد

استاد شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

Abstract

Khalida Hussain is an eminent Urdu short story writer. She is considered among the founders of modern Urdu Fiction. The main themes of her fiction are existentialism, materialism, feminism, nostalgia, fear, terror, psychological and human inner complexes, concept of death and concept of time etc. There are many dimensions in her concept of time. It is an immutable and invincible reality. Our time (life) is decreasing in every second. Best time for a man is its youth and bad time is old age. No one is safe from its damages. The bad effects of time are mostly on females. Only death can overcome time.

Key words: Khalida Hussain, stories, short stories, time, concept, analysis, analytical study

خالدہ حسین (2019-1937) ہمارے عہد کی ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ ان کے چھے افسانوی مجموعے شائع ہوئے جن میں ''پہچان'' (1981ء)، ''دروازہ'' (1984ء)، ''مصروف عورت'' (1989ء)، ''ہیں خواب میں ہنوز'' (1995ء)، ''میں یہاں ہوں'' (2005ء) اور ''جینے کی پابندی'' (2017ء) شامل ہیں۔ پہلے پانچ افسانوی مجموعوں پر مشتمل "مجموعہ خالدہ حسین" بھی شائع ہو چکا ہے۔ متعدد افسانے ایسے بھی ہیں جو ادبی رسائل میں شائع تو ہو چکے ہیں، مگر ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ خالدہ حسین نے 1960 کے لگ بھگ باقاعدہ طور پر لکھنا شروع کیا۔ ان کا نام جدید افسانے کے بانیوں میں لیا جاتا ہے۔

ہر ادیب اپنے عصر کی آواز ہوتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے مسائل اور موضوعات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ یہ مسائل و موضوعات سیاسی، مذہبی، معاشرتی، ثقافتی، نفسیاتی اور متعدد دوسری اقسام کے ہو سکتے ہیں۔ ہر ادیب ان موضوعات پر کسی نہ کسی لحاظ سے اپنا ردِ عمل دیتا ہے، تاکہ اپنے قلم کے ذریعے اس خاص مسئلے پر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکے۔ خالدہ حسین نے بھی اپنے افسانوں میں مختلف موضوعات کا احاطہ کیا ہے، جن میں وجودیت، تانیثی مسائل و معاملات، ادیبوں کے مسائل، معاشرتی موضوعات، نفسیاتی و انسانی داخلی موضوعات، ماضی پرستی، تصوف، خوف، دہشت، جبر و اختیار، بے نامی، بے یقینی، موت کا تصور، وقت کا تصور وغیرہ ایسے موضوعات شامل ہیں۔ اس مضمون میں ہم خالدہ حسین کے ہاں وقت کے تصور کا ان

کے افسانوں کے تناظر میں جائزہ لیں گے۔ وقت کا تصور خالدہ حسین کے افسانوں کا ایک بڑا اور اہم موضوع ہے، جس کو وہ مختلف جہات اور مختلف زاویوں سے بیان کرتی ہیں۔ ان کے خیال میں وقت اپنی اکائی میں اگرچہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا مگر ہمارے حصے کا وقت ہر لمحہ کم سے کم ہوتا جا رہا ہے جس طرح پانی کے قطرے انسانی مٹھی سے آہستہ آہستہ گر جاتے ہیں، اسی طرح وقت بھی آہستہ آہستہ ہمارے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے۔ اگر ہم نے اپنے حصے کے وقت سے فائدہ نہ اٹھایا تو کفِ افسوس ملتے رہ جائیں گے۔ ہمیں جو بھی کام کرنا ہے اسے جلد از جلد مکمل کر لینا چاہیے۔ مناسب موقع کا انتظار کرتے ہوئے کاموں کو ٹالتے نہیں جانا چاہیے۔ ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم اس مناسب وقت کے انتظار میں اس دنیا سے ہی چلے جائیں وہ مناسب وقت کبھی نہ آئے۔

چناں چہ وہ وقت آنے کا انتظار کرتی رہی مگر وقت کو آنا کہاں سے تھا۔ وقت تو ہر دم موجود تھا۔ موجود ہے۔ ہماری مٹھیوں میں سے پانی کی طرح قطرہ قطرہ گر کر ریت میں جذب ہو رہا تھا۔ پھر ہم کس وقت کے انتظار میں رہیں؟ کس لمحے کے منتظر؟ جب کہ جو لمحہ ازل سے شروع ہو چکا ہے۔ کبھی ختم نہ ہوگا۔ کبھی ختم نہ ہوا۔ (1)

اسی طرح وہ سمجھتی ہیں کہ بے جان چیزوں کو تو مرمت وغیرہ کرا کر پھر سے نیا بنایا جا سکتا ہے، مگر ایک انسان ہی واحد چیز ہے جس کا وقت لوٹایا نہیں جا سکتا۔ وہ پھر سے جوان نہیں بن سکتا۔ اگرچہ کریمیں، لوشن، مساج وغیرہ کسی حد تک اس کی عمر کو چھپا سکتی ہیں مگر ایک دن یہ اشیا بھی ناکام ہو جاتی ہیں اور انسان اپنی اصل حالت میں، اپنی بڑھاپے کی حالت میں واپس آ جاتا ہے۔ گزرتے وقت کے انسان پر پڑنے والے اثرات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہوتے ہیں۔ ان کے افسانے "مکالمہ" میں ایک عورت کے صوفے کے ساتھ ہونے والے مکالمے میں عورت کی پل پل بدلتی صورتِ حال قاری پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ وقت انسانوں کے چہروں اور جسموں کی تروتازگی اور بناوٹ پر بہت برے اثرات مرتب کرتا ہے۔

"گہرے مشاہدے کے بعد اس نے بہت سے حقائق دریافت کیے تھے۔ کس قسم کی روشنی کے عین نیچے ہرگز نہیں بیٹھنا چاہیے۔ چہرے کے خد و خال اپنی تمام کمزوریوں کے ساتھ ابھر آتے ہیں۔ چہرے کی گولائی روشنی کے کس زاویے پر بہتر طور پر ابھرتی ہے۔ کھلی دھوپ میں چہرے کے کس حصہ اور ناک اور رخساروں کے کس زاویے کو رنگ و روغن سے زیادہ احتیاط کے ساتھ چھپانا چاہیے۔ چشمہ کا کون سا فریم آنکھوں اور اس کے گرد کے علاقے کا بہتر کیموفلاج کرتا ہے۔ گردن کے حالات کس وضع کی قمیض سے ڈھکے چھپے رہتے ہیں۔" (2)

خالدہ حسین کا ایک اور افسانہ "گھڑی" بھی اسی موضوع پر ہے، بلکہ اس کا عنوان بھی وقت سے متعلق ہے۔ اس افسانے میں مصنفہ بتانا چاہتی ہیں کہ وقت کائنات کی ایک اٹل اور لازوال حقیقت ہے جس کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ صرف وقت ہی ایک ایسی شے ہے جس کو فنا نہیں۔ باقی ہر چیز زوال پذیر ہے۔ وقت ہر چیز پر اپنے پنجے گاڑ دیتا ہے اور اسے موت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ یہ کسی صورت رکتا نہیں، ٹلتا نہیں، اس سے فرار ممکن نہیں۔ بی بی امینہ کے بقول: "اس (افسانے) میں بتایا گیا ہے کہ وقت ایک اٹل اور لازوال چیز ہے جس کو شکست دینا ممکن نہیں۔ چنانچہ جب بھی اور جس کسی نے بھی اسے شکست دینے کی کوشش کی، وقت نے خود اسے بدترین انجام سے دوچار کیا۔" (3)

اپنے افسانے "جو کچھ جیسا ہے 'جہاں ہے" میں وہ بتاتی ہیں کہ اگرچہ انسانی جسم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شکست وریخت کا شکار ہوتا رہتا ہے، مگر اس کے اندر کی دنیا،اس کی آرزوئیں، خوشیاں، جذبات، خواب وغیرہ سب اسی طرح جوان رہتے ہیں۔ وقت ان پر اثر نہیں کرتا، ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

باقی اندر کی دنیا جو اس سال خوردہ جسم اور تنگ سے تنگ ہوتے کاسہ سر میں آباد ہے۔ وہ تو اسی طرح ہے 'روزِ اول سے۔ وہی خوشبوئیں، چہرے، گلیاں اور مکان اور کتابوں کے ورق اور فضاؤں میں اڑتے واقعات اور آسمانوں سے برستے خواب۔ یہ سب کے سن سخت جان۔ وقت ان کے قریب سے کنی کترا کے گزر جاتا ہے۔[4]

ان کے افسانے "بلیک ہول" میں بلیک ہول کی ایک علامتی معنویت تو انسانی حرص و ہوس کی ہے جو اعلیٰ انسانی اقدار کو ہڑپ کیے جا رہا ہے، لیکن اس کا دوسرا علامتی مفہوم وقت کے تناظر میں ہے۔ وقت ایک ایسا بلیک ہول، ایک ایسی عفریت ہے جو اپنے رستے میں آنے والی ہر چیز کو موت کے گھاٹ اتار رہی ہے۔ انسان پیدا ہوتا ہے۔ پھر جوان ہوتا ہے۔ مال و دولت، عزت، منصب، ناموری وغیرہ کماتا ہے، مگر آخر کار اسے موت آ دبوچتی ہے۔ یہ ایسا بلیک ہول ہے جو ہر لمحے زور سے اور پوری کشش سے انسان کو اپنی طرف کھینچتا ہی چلا جا رہا ہے۔ وہ کسی بھی طرح اس گرفت، اس بلیک ہول سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔

اسی طرح اس افسانے میں وہ یہ بھی بتاتی ہیں کہ وقت انسان کی حیثیت اور پوزیشن تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے۔ کل وہ جوان تھا اور کسی کے لیے ڈھال تھا تو آج وہ بوڑھا ہے اور کوئی اس کے لیے ڈھال بنا ہوا ہے۔ اگر وہ کل کسی کے لیے سہارا بنا ہوا تھا تو آج وہی لوگ اس کا سہارا بنے ہوئے ہیں۔

"زندگی کے مہرے کتنی جلدی ایک دوسرے کی جگہ لے لیتے ہیں۔ آج یہی آصف اسے اپنے لیے ڈھال محسوس ہوتا ہے جب کہ کل وہ خود اس کے لیے ڈھال تھا۔ وار کرنے والے اور وار سہنے والے یوں جھپٹ کر ایک دوسرے کی جگہ لے لیتے ہیں۔"[5]

اسی طرح ان کا ایک افسانہ "مایا" ہے جس کی ہیروئن رخشندہ جو کہ نوجوانی میں بڑی خوبصورت، سلم اور سمارٹ ہوتی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ چالیس پچاس سال کی عمر میں وہ گوشت کا ایک پہاڑ بن جاتی ہے۔ اس میں نزاکت و نفاست نام کو بھی باقی نہیں رہتی۔ اس افسانے میں وہ یہ خیال ظاہر کرتی ہیں کہ کائنات کوئی ساکت و جامد شے نہیں ہے، بلکہ وقت کے ساتھ گزرتے ہوئے واقعات کا مجموعہ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے جسم میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور وہ اپنی ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل جاتا ہے، یہ بھی ایک واقعہ ہے۔ لہٰذا اشیا یا انسان بذاتِ خود اپنا وجود نہیں رکھتے بلکہ واقعات کی شکل میں جاری رہتے ہیں۔ "نہ پا ہے رکاب میں" کا موضوع بھی وقت ہے۔ اس افسانے میں مصنفہ وقت کے متعلق اپنا تصور بیان کرتی ہیں۔ ان کے خیال میں وقت ایک ناقابل شکست حقیقت ہے لیکن موت ایک ایسی چیز ہے جو وقت کو بھی شکست دے دیتی ہے۔ جب تک انسان زندہ رہتا ہے اس کے خلیوں میں توڑ پھوڑ کا عمل جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وقت انسان کے چہرے سے حسن و نزاکت اور شگفتگی و شادابی چھین کر بد رونقی، بد صورتی اور بڑھاپے جیسے عناصر دے دیتا ہے۔ لیکن موت ہی وہ واحد چیز ہے جو وقت پر قابو پا لیتی ہے یا پا سکتی ہے۔ انھوں نے افسانے میں ایک نوجوان کوہ پیما جوڑے کا قصہ بیان کیا ہے جس میں مرد برف کے نیچے دب کر مر جاتا ہے۔ برسوں بعد جب اس کی لاش دریافت ہوتی ہے اور اس کی بیوی کو شناخت کے لیے بلایا جاتا ہے تو عورت بوڑھی ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کا چہرہ جھریوں بھرا اور بال سفید ہوتے ہیں، لیکن اس کا شوہر چونکہ جوانی میں

GUMAN
ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.2 (2024)
(April-June)

مرا تھا اس لیے اس کی لاش اب تک جوانی کے خدوخال لیے ہے۔ یعنی موت نے وقت پر فتح حاصل کرلی۔ وہ لکھتی ہیں: "زندہ کو وقت روندتا ہے اور مردہ وقت کو پامال کردیتا ہے۔"(6)

بی بی امینہ اس افسانے کے بارے میں لکھتی ہیں: "نہ پا ہے رکاب میں "اس حقیقت کو آشکارا کرتا ہے کہ دنیا میں کوئی چیز وقت کے مقابل نہیں آسکتی۔ صرف موت ہی ایسی چیز ہے جو وقت پر فتح پاسکتی ہے۔"(7)

یہی تصور قدرے ترمیم کے ساتھ ان کے افسانے "رہائی" میں بھی موجود ہے۔ ان کے خیال میں جب کسی جاندار (بشمول انسان) پر کوئی مشکل وقت آن پڑتا ہے، کوئی ہونی ہونے والی ہوتی ہے تو وہ اس سے بچنے کے لیے حیلے بہانے سے وقت حاصل کرتا ہے، جس سے بعض اوقات وہ ہونی ٹل جاتی ہے لیکن ایک ہونی ایسی ہے جو وقت حاصل کرنے کے باوجود ہو کر رہتی ہے اور وہ ہے موت۔ موت کا لمحہ اٹل ہے۔ انسان اس سے بچنے کے لیے وقت کی گود میں پناہ لیتا ہے، لیکن وقت جو ہر چیز پر غالب ہے، موت سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ موت کی قینچی سانسوں کی ڈور کو کاٹ دیتی ہے اور انسان کو وقت کی قید سے رہائی مل جاتی ہے۔ پیدا ہونے سے لے کر موت تک کا سفر دراصل اسی ہونی کو ٹالنے کے لیے وقت حاصل کرنے کی بے سود کوشش ہے۔ کسی بھی سمت، کسی بھی جگہ کے لوگ موت کی زد سے باہر نہیں ہیں۔

"تیسرا پہر" بچپن میں سنی گئی ایک کہانی کی عصرِ حاضر میں تطبیق ہے لیکن اس میں بھی وقت کے حوالے سے ان کا ایک خاص تصور پنہاں ہے۔ افسانے میں شہزادے کی بہن شہزادے کو، جو کہ راج ہنس بن چکا ہوتا ہے، انسانوں کی جون میں واپس لانے کے لیے سات سال کا چپ کا روزہ رکھتی ہے۔ ساتویں سال کے آخری دن (جب کہ اس کے خیال میں سات سال مکمل ہو چکے ہوتے ہیں) وہ چپ کا روزہ توڑ دیتی ہے۔ چونکہ چپ کا روزہ سات سال مکمل ہونے سے پہلے ہی توڑ دیا جاتا ہے لہٰذا اس کا بھائی انسانوں کی جون میں واپس نہیں آسکا اور اس کی بہن کی وہ ساری تپسیا، ساری محنت اکارت جاتی ہے۔ اس کہانی میں علامتی پیرائے میں مناسب وقت پر کلام کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔ بعض اوقات غلط لمحے میں کی گئی بات آپ کی برسوں کی ریاضت کو ضائع کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ ہر بات کا ایک مناسب وقت ہوتا ہے۔ اگر وہ اس وقت نہ کہی جائے یا غلط وقت پر کہی جائے تو بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہوتا ہے۔ بات کے لیے درست وقت کا انتخاب بہت ہی ضروری ہے۔

گزرے ہوئے وقت کی بازیافت بہت مشکل ہوتی ہے۔ اگر کوئی انسان ایسا کرنا بھی چاہے تو اسے عموماً ناکامی ہوتی ہے۔ خالدہ حسین کا افسانہ "چوکھٹ" اسی ماضی کی بازیافت کی لاحاصل خواہش کا اظہار ہے۔ ان کے خیال میں ہر انسان کو اپنے ماضی سے، چاہے وہ جیسا بھی ہو، پیار ہوتا ہے اور وہ اس کی بازیافت کرنا چاہتا ہے لیکن ایسا ہونا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اسی بات کو افسانے میں شجرہ نسب نہ ملنے کی علامتی معنویت سے ظاہر کیا گیا ہے۔

ان کے افسانے "موہن جو دڑو" کا موضوع بھی وقت کی کرب ناکی ہے۔ وقت کا وہ عرصہ جس میں کسی قسم کی سود مندی شامل نہیں ہوتی ایک لحاظ سے مدفون لاش کی طرح ہوتا ہے جس سے سڑاند اور بدبو آتی ہے۔ وہ لوگ جو وقت کو سود مند طریقے سے مثبت سرگرمیوں میں نہیں گزارتے اور ہر وقت مال کی حرص و ہوس میں لگے رہتے ہیں، وقت ان کو روند دیتا ہے، کھنڈر بنا دیتا ہے۔ یہ تباہی و بربادی صرف ظاہری یا جسمانی سطح پر ہی نہیں ہوتی بلکہ ذہنی و روحانی سطح پر بھی اسی شد و مد سے جاری رہتی ہے۔ وقت ان کو تعفن زدہ لاشیں بنا دیتا ہے جن کی قربت سے بدبو اور کراہت آتی ہے۔

ادھیڑ عمری اور بڑھاپا بھی انسان کے اپنے حصے کے وقت یعنی زندگی کی منازل ہیں۔ خالدہ حسین کے خیال میں یہ وقت انسان کے بے بہت مشکل ہوتا ہے۔اس کے ارد گرد رہنے والے تمام افراد شعوری یالاشعوری طور پر اس کی موت کے خواہش مند ہوتے ہیں یا کم از کم اس کی موت کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ سارے لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ بلکہ ان میں بہت سے محبت کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔اس کے باوجود اگر وہ سب اس کی موت کا انتظار کر رہے ہیں تو یہ بھی وقت کی کرب ناکی ہے۔وقت کے بارے میں ان کا یہ تصوران کے افسانے "پکنک" میں بیان کیا گیا ہے:

(ہمارے بچے)اس کے باوجود ہمارے لیے تشویش محسوس کرتے ہیں۔ہمہ وقت تشویش میں مبتلا رہتے ہیں۔ محض یہ احساس کہ اطراف میں کوئی ایسا نفس موجود ہے جو پل پل موت کے قریب جانے کے باوجود نہیں جارہا اور نہ جانے کب تک نہ جائے۔ایک بے آرامی کی کیفیت۔یہ بے آرامی ان کے لیے خاصی کڑی آزمائش ہے۔ہمارا وجود محض یہ ایک عالمی بے آرامی کا سرچشمہ ہے۔(8)

"معدن" میں بھی ضمنی طور پر وقت کا تصور بیان کیا گیا ہے۔افسانہ نگار کے خیال میں گزرتا وقت بڑا بے رحم ہے۔ وہ آہستہ آہستہ پورے جسم سے توانائی زائل کر دیتا ہے۔ پھر کسی بھی چیز پر گرفت قائم نہیں رہتی۔ نہ ہی اپنے اعضا پر اور نہ ہی اپنے افعال پر۔اس کی جلد ڈھلک جاتی ہے۔ ٹھوڑی کے نیچے گوشت کی تہیں جمنے لگتی ہیں۔آنکھوں کے گرد حلقے اور اس جیسے دوسرے نشانات پڑ جاتے ہیں۔چال لڑکھڑاہٹ زدہ ہو جاتی ہے۔ بالوں کا رنگ سفید ہو جاتا ہے۔اس کے اعضا چاہتے ہوئے بھی کام نہیں کر پاتے۔اور یہ صورتِ حال ہر گزرتے دن کے ساتھ گھمبیر ہوتی چلی جاتی ہے۔ بڑھاپے میں انسان صرف اس انتظار میں رہتا ہے کہ دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔یہی صورتِ حال "نوٹس" میں بھی بیان کی گئی ہے۔

"جواں سالی اور توانائی کے موسموں میں سب کچھ اختیار میں ہوتا ہے۔ جب ہاتھ باگ پر ہوتا ہے اور پاوں بھی رکاب میں۔ مگر پھر سب کچھ ڈھیلا پڑتا جاتا ہے اور گرفت، گرفت نہیں رہتی،ایک خواب آلود تشنج ہو جاتی ہے۔"(9)

"مجھے روک لو" میں بھی ضمنی طور پر وقت کا تصور بیان کیا گیا ہے۔ کسی بھی انسان کے لیے وقت کبھی بڑا پر کشش اور خواب آگیں ہوتا ہے، مگر کبھی روکھا، پھیکا، نہ کٹنے والا اور اداسی بھرا ہوتا ہے۔کچھ عناصر ہوتے ہیں جن کی موجودگی میں وقت پر کشش بن جاتا ہے اور انھیں عناصر کی غیر موجودگی میں وہ روکھا پھیکا ہو جاتا ہے۔ عام طور پر آپ کا محبوب اور اس سے وابستہ اشیا اور جگہیں وقت کو خوبصورت اور دل نشیں بناتے ہیں مگر ان اشیا کی غیر موجودگی میں وقت کاٹے نہیں کٹتا۔بنیادی طور پر اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے اچھا یا برا، روکھا پھیکا یا پر کشش وقت بذاتِ خود کوئی چیز نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ آپ کے اندر کا موسم ہوتا ہے جو وقت کو پر کشش یا اداسی بھرا بنا دیتا ہے۔ اگر آپ اندر سے خوش ہیں تو باہر جس قسم کے بھی حالات ہوں، آپ خوشی ہی محسوس کریں گے۔ لیکن اگر آپ اندر سے اداس ہیں تو باہر کا سہانا اور خوب صورت موسم بھی آپ کو خوشی نہیں دے سکتا۔

ان کے ہاں وقت کا ایک اہم تصور یہ بھی ہے کہ تمام انسانوں کی دونوں جنسوں میں وقت کے سب سے زیادہ برے اثرات عورت ذات پر ہوتے ہیں۔ وہ بہت جلد اپنی اصل دلکشی کھو دیتی ہے۔ پھر مصنوعی دل کشی کے لیے لوشن، کریمیں، پاوڈر اور اسی طرح کے دوسرے وقتی سہارے ڈھونڈتی ہے، لیکن یہ وقتی سہارے بھی زیادہ دیر تک اس کا ساتھ نہیں دیتے اور کسی نہ کسی طرح سے گزرتے وقت کے اثرات اس کے جسم پر ظاہر ہو کر

ہی رہتے ہیں۔ "زمانے کی قسم بے شک انسان صریح خسارے میں ہے۔ مگر سب سے زیادہ انسانوں کی وہ جنس جو میں ہوں۔ جس طرح وقت اس جنس کو کھاتا ہے، کسی کو نہیں کھاتا ہے۔اور لمحہ لمحہ ہمارے گوشت ہماری ہڈیوں سے علیحدہ ہوتے جاتے ہیں"(10)

"آدھی عورت" میں وہ یہ بتاتی ہیں کہ آج کے انسان نے اپنے آپ کو بہت مصروف کر لیا ہے۔اتنا مصروف کر لیا ہے کہ اس کے پاس ایک اطمینان سے بیٹھنے کے لیے نہیں ہے۔ وہ تھوڑے سے وقت میں زیادہ مال و دولت سمیت لینا چاہتا ہے تاکہ زندگی آرام سے گزارے لیکن اسی تگ و دو نے اس کو بے آرام و بے سکون کر دیا ہے۔ آج کے انسان کے پاس ایک دوسرے کے لیے حتیٰ کہ اپنے گھر والوں کے لیے بھی بالکل وقت نہیں ہے۔ وہ دوسروں کے ساتھ وقت گزارنے کو وقت کا ضیاع سمجھتا ہے۔اس کی خود ساختہ مصروفیت اسے کسی پل چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ لیکن اس ساری بھاگ دوڑ کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیوں کہ اگلے دن پھر سے کچھ نئے کام اس کے منتظر ہوتے ہیں۔ "وقت وقت۔ وقت کہاں ہے۔ تھورے سے وقت میں ہم کو کس قدر بے شمار کام کرنا ہے۔ گھڑی کی سوئیوں کی طرح دن کے اجالے سے رات کے اندھیرے تک۔ چل چل چل اور پھر وہیں پر جامد جہاں سے چلتے ہیں۔"(11)

اسی افسانے میں وہ یہ منفرد نکتہ بھی ابھارتی ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ دنیاوی طور پر زیادہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ان کے پاس مال و دولت دوسروں کے مقابلے میں زیادہ آ جاتا ہے۔ جب کہ بعض انتہائی تنگی سے زندگی گزارتے ہیں۔ آسائشات تو درکنار ان کے پاس بنیادی ضروریاتِ زندگی ہی میسر نہیں ہوتیں یا بہت کم ہوتی ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ جسمانی طور پر زیادہ طاقت ور، صحت مند اور فعال ہوتے ہیں جب کہ بعض لوگ بیمار، کمزور ہوتے ہیں اور قدرے غیر فعال زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے وقت کے پہیے کو الٹا دے تو جو آج امیر ہیں وہ غریب اور غریب امیر ہو جائیں۔ تندرست بیمار و کمزور ہو جائیں اور کمزور و بیمار طاقت ور ہو جائیں۔ صنفِ نازک پر وقت کے اثرات کے بارے میں ان کا نکتہ نظر یہ ہے کہ سب سے آگے، سب سے کامیاب تو وہ ہے جو وقت سے بھی آگے ہے۔ لیکن کیا جائے کہ کوئی انسان بھی وقت سے آگے نہیں ہے۔ سب اس کی قید میں ہیں، لہٰذا سب انسانوں پر وقت منفی اثرات پیدا کرتا ہے لیکن عورت ذات پر مردوں کے مقابلے یہ زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ ان کی شخصیت کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے۔اسی لیے وہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ الم ناک اور قابلِ رحم ہیں۔ "سب سے آگے تو وہ ہے جو وقت کی گرفت سے باہر ہے اور وقت کی گرفت ہم پر سب سے زیادہ سخت ہے۔ اسی لیے ہم اس قدر مضحکہ خیز حد تک المناک ہیں۔"(12)

"تفتیش" میں وقت کے حوالے سے وہ یہ بتانا چاہ رہی ہیں کہ اگرچہ وقت کے جبر سے فرار ممکن نہیں، لیکن جس حد تک ممکن ہو، عورت ذات کو وقت کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دینا چاہیے۔ جس عورت پر وقت حاوی ہو گیا اور اس کی دلکشی و جاذبیت چھین لی، عمومی طور پر پورا معاشرہ اور خصوصی طور پر اس کا خاوند اسے رد کر دیتا ہے۔ عورت پر وقت کو کبھی حاوی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ میں نے بالآخر سیکھا اور جب سیکھ لیا تو پتا چلا کہ اب تک وقت کی ہلاکتوں کا سامنا میں بے کار کرتی رہی۔۔۔ کیون کہ عورت نے جب وقت کی ہلاکت کا احساس کیا اور اس کے خوف کا ذائقہ چکھا، وہ مردود ہو گئی۔"(13)

لیکن وقت تو ہر صورت میں گزرنا ہوتا ہے اس لیے یہ کیسے ممکن کہ ایک عورت اس سے محفوظ رہ سکے۔ غالباً وہ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ عورت کو گزرتے وقت، بڑھتی عمر کو اپنے اعصاب پر سوار نہیں کرنا چاہیے۔ صرف اسی صورت میں وہ اس کی ہلاکت سے خود کو زیادہ سے زیادہ محفوظ رکھ سکتی ہے۔

اسی افسانے میں وہ یہ بھی بتاتی ہیں کہ گزرتے وقت کا اندازہ لگانے کے لیے یا اسے ماپنے کے لیے انسان کو بیرونی وسائل مثلاً گھڑی، کلاک، سورج اور چاند کی حرکات وغیرہ دیکھنے کی بھی قطعاً ضرورت نہیں ہے بلکہ انسان کے اندر اس کے دل کی ہر دھڑکن اسے گزرتے وقت کا پتا رہی ہے۔ یہ دھڑکن گھڑی کی ٹک ٹک کی مانند اسے بتا رہی ہے کہ اس کے پاس موجود وقت یا اس کے حصے کا وقت اس کی گرفت سے آہستہ آہستہ نکل رہا ہے۔ "یک دم خون کی لہریں اس کے کانوں تک یورش کرنے لگیں۔۔۔وقت۔ وقت اس کی رگوں میں تھا اور اس پر حاوی تھا، اس کی شہ رگ سے پھٹا پڑتا تھا۔"(14)

یہی نکتہ وہ اپنے افسانے "گھڑی" میں بھی قدرے ترمیم کے ساتھ ابھارتی ہیں کہ جب سے انسان نے گھڑی، کلاک یا وقت بتانے والے دوسرے آلات ایجاد کیے ہیں وہ ان آلات کا، اور دوسرے معنوں میں وقت کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ آلات وقت کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تبدیل کر دیتے ہیں، جس سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وقت جلدی گزر رہا ہے۔ لہٰذا ہر انسان جلد سے جلد اپنے کام نمٹانے کی خاطر ان آلات کا، وقت کا محتاج ہو کر رہ گیا ہے۔ ان آلات نے وقت کی مکمل اکائی کے حصے بخرے کر کے انسانی زندگی اور انسان کی خوشیوں کو بے پناہ نقصان پہنچایا ہے۔ ضروری ہے کہ وقت کی اس ہلاکت خیزی سے بچنے کے لیے انسان ان آلات سے مکمل طور پر اجتناب کرے۔

"گھڑی ایک بے کار فالتو شے ہے۔ انسان نے خود ہی بنائی اور خود ہی اس کا اسیر ہو گیا۔ ایک لمحہ اس کے بغیر نہیں گزار سکتا۔۔۔ ہم اس کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ کام چلا سکتے ہیں۔ پہلے یہ تو بتاؤ کہ یہ دو سوئیاں اور کچھ نقطے اور لکیریں ہمارے حاکم کیسے ہو گئے اور وقت ان کے اندر کیسے قید ہو گیا۔"(15)

لیکن ایک انسان چاہ کر بھی وقت کی اس تقسیم سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر وہ تمام گھڑیوں، کلاک وغیرہ سے اجتناب بھی کر لے تب بھی دن رات کا وقت پر آنا جانا، قدرت کے بنائے ہوئے موسم، فصلوں کی مخصوص رتیں، پرندوں کا ایک مخصوص وقت میں گھونسلے بنانا اور افزائشِ نسل کرنا وغیرہ ایسے بے شمار عوامل وقت کی اسی تقسیم اور انسان سمیت تمام جانداروں کو اس کا پابند ظاہر کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر اور کوئی چیز نہ ہو تب بھی انسان کے جسم کے اندر دل کی دھک دھک گھڑی کی سوئی کی ٹک ٹک کے مشابہ اسے گزرتے وقت کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ "اب اس نے غور کیا۔ خود اس کے گلے اور سینے میں ٹک ٹک ٹک، نبض کی دھڑکن، گھڑی تو اس کے اندر چھپی تھی۔"(16)

"نام کی کہانی" میں وہ بتاتی ہیں کہ وقت کبھی تو بہت جلدی گزر جاتا ہے اور کبھی گزرنے کا نام تک نہیں لیتا۔ اگر اندر کا موسم خوش گوار ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سال لمحوں میں سمٹ گئے ہوں اور اگر اندر کا موسم اداس ہو تو لمحے اتنے طویل ہو جاتے ہیں کہ وہ سالوں پر محیط ہو جاتے ہیں۔ "اچانک یوں ہونے لگا کہ سورج ڈوبنے کا عمل دیکھتے ہی دیکھتے طویل ہوا۔ سورج گھنٹوں اندر باہر رہتا ہے۔"(17) وقت کے برے اثرات سے بچنے کے لیے انسان چاہتا ہے کہ وہ پھر سے اپنے بچپن میں چلا جائے جہاں کسی قسم کا کوئی غم نہ ہو، کوئی فکر نہ ہو۔ لیکن ایسا ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ انسان گزرے وقت کے فاصلے کو کبھی نہیں پاٹ سکتا۔

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.2 (2024)
(April-June)

حوالہ جات

1۔خالدہ حسین بھٹی، مشمولہ: مجموعہ خالدہ حسین(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،2008ء)ص247

2۔ایضاً"، مکالمہ مشمولہ مجموعہ خالدہ حسین، ص342

3۔بی بی امینہ: خالدہ حسین: شخصیت اور فن(اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،2017)ص58

4۔خالدہ حسین:"جو کچھ جیسا ہے'جہاں ہے"، مشمولہ مجموعہ خالدہ حسین، ص461

5۔ایضاً،"بلیک ہول"، مشمولہ مجموعہ خالدہ حسین مشمولہ، ص469

6۔ایضاً،"نہ پاہے رکاب میں"مشمولہ مجموعہ خالدہ حسین، ص:533

7۔بی بی امینہ، خالدہ حسین: شخصیت اور فن، ص58

8۔خالدہ حسین:"پکنک"، مشمولہ جینے کی پابندی(اسلام آباد:سنگِ میل پبلی کیشنز،2017ء)ص61،62

9۔ایضاً"معدن"مشمولہ جینے کی پابندی، ص80

10۔ایضاً"آدھی عورت"مشمولہ مجموعہ خالدہ حسین، ص188۔189

11۔ایضاً، ص189

12۔ایضاً، ص191

13۔ایضاً،"تفتیش""، مشمولہ مجموعہ خالدہ حسین، ص182۔183

14۔ایضاً، ص186

15۔ایضاً"گھڑی"مشمولہ مجموعہ خالدہ حسین، ص454

16۔ایضاً، ص456

17۔ایضاً،"نام کی کہانی"، مشمولہ مجموعہ خالدہ حسین، ص62

کتابیات

بی بی امینہ، خالدہ حسین: شخصیت اور فن(اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،2017)

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.2 (2024)
(April-June)

خالدہ حسین: "پکنک"، مشمولہ جینے کی پابندی (اسلام آباد: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2017ء)
خالدہ حسین، مجموعہ خالدہ حسین (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2008ء)

Introduction

Language and power cannot be separated in the discourse of politics as they are closely related. Through the practice of language, political leaders and institutions have been able to dominate and even manipulate the society as they create a particular understanding of reality. Reflecting upon the discursive construction of political realities and agency in relation to languages strategies and power relationships, this critical argument map examines the ways in which language works to assert, maintain, naturalizes and justify power. Thus, looking into the forms of argumentation and discursive strategies employed by political actors, one can study the processes by which language functions as a mean of power and come to learn various interpenetrating, subtle and not so subtle ways through which the act of communication affects its object and the world.

Rhetoric is a tool where political leaders make and tell captivating stories for the public hence ensuring that they remain in power. According to Fairclough (2001), language is a central aspect whereby political actor can influence the politics of language and construct the view on the reality, in a bid to gain support or eliminate rivals. The embracing of metaphors, framing and repetition fosters emotions and even Urgency/ solidarity aspects as described by Lakoff (2004). For instance, when one uses terms such as 'war' or 'battle' in relation to things like 'terror' or 'climate change,' it creates a strong imagery that makes people support a particular cause. This manipulation of words not only polls people's mentality but also promotes the authority and status quo that the rulers desire. But the way they phrase these messages is very important as this will make them bring the policies that they wish to implement into conformity with the ideologies of those who elected them. These are particularly seen in the case of campaign speeches, policy statements, media appearances and the like since the language used and the embrace of narrative are carefully crafted to win the hearts or the minds of the listeners or the audience.

Besides shaping the general perceptions of the audience, language also has a critical role in reinforcing or challenging power relations and other elements of socio-political systems. Cited in Van Dijk (1998), dominant and hegemonic groups use discourse as one of the instruments for asserting and reestablishing hegemonic control over their subordinates. Power relations are reflected at the deep level of language and they are connected with the political discourse that naturalizes some modes of practice and produces the others as deviant or marginal. For instance, the euphemism lowers the perception of the public towards controversial policies, hence weakening their resistance towards the key arguments (Chilton, 2004). Phrases such as 'collateral damage' instead of 'buckshot' or 'killer raid' and 'enhanced interrogation techniques' instead of 'torture' are euphonic terms which make the underlying implications less harsh.

In addition, through the manipulation of the information released into the public domain and establishment of rules that govern the political agenda, the rulers are in a position to shape the debate by only addressing that which is pre-approved and ensures that any opposition to the dominant paradigm is kept to a minimum. Freedom of speech and any open discussion is usually suppressed through 'media control', 'censorship' and 'propaganda' that are used to ensure people adhere to the norms of the dominating ideology. Language domination also applies to writing new

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.2 (2024)
(April-June)

laws and implementing existing ones as well as establishing and implementing policies. The use of language in law, usually written in legal jargons that are intricate and grandiloquent, provides both the veneer of authority and a veil to hide it (Bourdieu, 1991). The conversion of these linguistic rules into law essentially entails the standardization of specific power relationships within specific forms of text, which makes it dangerous for ordinary citizens to regulate their interactions with the law on their own. Legalized language includes the usage of technical terms, which coming from the legal aspect, often puts offs the public in their legal issues. In addition, the perverted political and legal practices of differentiation enhance such power relations and contribute to the exclusion of marginalized groups or the suppression of oppositional voices. For example, measures that are formulated in a seemingly universal manner yet are processed as discriminative against certain groups identify how language instrumentalist oppression. In this context, it becomes clear that the language and power relationship is not only about political rhetoric, official discourse, and coded language announcing policy shifts and changes in government but also about the strategies of power-knowledge regulating agendas and practices at the grassroots level of society. It therefore becomes clear that there is need to examine the discursive construction of legal documents and the nature of policy making so that the relations of power inscribed in the linguistic practices can be brought to light in order to achieve greater fairness in the administration of justice.

Language as Manipulative

The distal-near theories thus stress on language as a key weapon of influence in political contexts. That is why politicians and leaders often use rhetoric – to gain votes, change people's perspective on certain issues, or simply to curb the influence of the opposing political camp. In other words, the parties use various figures of speech that include euphemisms, hype, and words with hidden meanings in an attempt to tame the storytelling narrative to fit their preferences. These coded grey concepts can alter the way people perceive situations and are able to accept rules normally observed as questionable, for example, instead of the term 'burying civilians' the term 'collateral damage' is used, which has made it easier for the Americans to carry on with the policies. The first one is that of hyperbole, where issues are exaggerated in order to create an element of fear or concern such as the demonization of immigration or the focus on national security. There are fans and non-fans, good guys and bad guys, justice and evil; this type of language therefore manipulates the feelings of people in a way to ensure they are on the side of the political framework being sold to them (Edelman, 1977, p.2).

Furthermore, the opposite side of this process was also present as it entailed more than just the art of speech and manipulation of words in order to control the flow of information but rather lies, distortion of facts and the spreading of propaganda. In autocratic governments for instance, language is employed as a tool for quelling dissent, rationalizing oppression, and providing a veneer of democracy to despotic rule. Herman and Chomsky argue that by restricting what people understand through information censorship, propaganda technique, or manipulation of information, those in power can maintain their control and ensure that opposition does not emerge. Media and communication systems as well as genre of the state is usually used to promote

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.2 (2024)
(April-June)

a particular version of the reality that supports the objectives of a regime and where necessary suppressing any other voice from coming out (Althusser, 1971). Such manipulation makes the truth invisible, and the population unaware of the essential information necessary for making the right decisions, which further helps the rulers to stay in charge.

Hence, the consequences of the manipulation of language are far-reaching, going beyond immediate political concerns and permeating the societal context. When language is employed to twist facts and bend the tangent of the target community, it is not only counter to general democracy but also leads to a decline in people's confidence in bodies of governance. Reliance on bias within a repetitious language that is more misleading influences the political acclimatization process and thus forms political consciousness where extreme poles are firmly entrenched (Tuchman, 1978). This manipulation can result in the polarization of society with the abnormally extreme views being more dominant then relatively reasonable opinions, leading to polarization of social and political opinions. It therefore becomes very important to bring out the manipulative force of language as a positive step towards developing a democratic political culture where the players and audience are equally privileged to make informed decisions and judgments on the information presented to them (Habermas 1984).

The Role of Discourse in Power Dynamics

Discourse is therefore a significant factor in reproducing power relations within political realms. Employers, teachers, managers and other figures of authority replicate these tendencies of language through expressions that subordinate minority groups and reenact prejudice. Discourse can then play an important role in the maintenance of power relations in that it constructs organisations and individuals as active agents of meaning construction which in effect sustains and perpetuates one particular way of thinking thus ensuring the hegemonic practices of some organisations and individuals remain intact. As the narratives of political empowerment continue to be sold in the media, political elites retain their domination because people begin to adapt to this social reality. This, as Van Dijk (1998) explains, amounts to the use of language to consistently position discourses in ways that legitimize existing power relations and marginalize critical opinions and other voices.

Additionally, language can be used as a way of discriminating groups of people or even stigmatizing them, through formulation of registers that substandard them. Words and phrases like 'illegals,' 'criminals,' 'aliens,' or 'terrorists' do not refer to something factual but are themselves already biases that seek to disempower particular groups and paint them as outlaws to justify the oppressive measures being taken against them. However, as Chilton (2004) has pointed out, the appropriate application of such labels can construct a societal binary division of sorts between 'us' and 'them,' and instill fear and racism. Hereby, using linguistic othering, such diverging groups can be excluded and sanctioned with strict measures, thus, preserving the existing social segregation and the existing hierarchy. By creating these negative semantic associations to sink into the voters' consciousness, the rulers contribute to the manipulation of the masses for the sake of implementing measures that would remain utterly inadmissible under any terms in democratic countries.

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.2 (2024)
(April-June)

The coercive aspect of discourse is also seen in the regulation of who can speak and whose voices are listened to. Minorities in particular are not able to fully engage in political processes due to their inferior number of opportunities to express themselves. Not only do such groups go unseen and unheard but their disadvantaged status is reinforced by being deprived a voice through which they might contest their exclusion and present their case. As stated by Fairclough (2001), the control of discourse is a form of power, which helps mantle the existing and perpetuate injustice and inequality, by establishing and maintaining 'frames' that set out the parameters of what may be considered 'proper' or 'permissible' top-down within the social relations of the society. This is done through anteriority or ownership of media and other essential facilities, political influences to ensure rigidity of power and lack of pluralism that encompass and support the oppressors.

Resistance and Subversion through Language

However, language is not only a tool of domination where political discourses are oppressive; it is also a discursive terrain of opposition. Linguistic features like irony, sarcasm, and metaphor are used by the opposition and the minority to fight against the majority and destroy the leading paradigm. For instance, counter narratives offer a different angle to the dominant and hegemonic discourses which sought to 'downplay,' 'other,' marginalize, and exclude the narratives of minorities and subjugated groups (Delgado & Stefancic, 2012). Such other histories may also provide a lens that the subordinate groups can use to exercise descriptive un-packaging and descriptive critique of the prevailing paradigm of worthwhile success. Like irony, satire also remains an effective weapon against oppression in that it uses humor to unmask the paradox of oppression in the political system, thus, denying the oppressors the moral ground to carry on with their practices (Hutcheon, 1994)..

This paper sought to explore how marginalized individuals and communities can regain control through counter narratives and how progressive social movements can leverage this mode of writing to change the dominant narratives. Irony and parody can be specifically employed to bring out the gap and the incongruity between the official representations of the ideology and the actual reality or the rhetorical performance can be done in such a way as to expose the contradictions inherent in the ideology of the ruling elites (Bakhtin, 1981). For instance, it has become customary for activist movements like Black Lives Matter to use media platforms, as well as rhetoric to fight against police brutality and systemic racism; they create a counter narrative to the otherwise dominant and hegemonic discourses on law and order in today's society (Rickford, 2016). Through them, such social groups can open the voices and actions that will challenge the established norms and stigmatized perceptions.

As shown through examples ranging from humor and irony to metonymic turns of phrase and the use of bacteria names to name a political party, it can be understood that resistance movements use language creativity to challenge the existing power relations and redraw the boundaries of political language. Language is used to reimagine and reimagine and communicate possible worlds, build the union of feeling, and call for collective action (hooks 1994). Such counter discourse is not static and consists of various elements, as it illustrates the creativity and

GUMAN
ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.7, Issue.2 (2024)
(April-June)

persistence of people who aim to change an unfair situation. Through performative subversion of dominant discourses, these movements also perform functions of subverting particular power-knowledge regimes and also of producing new politically possible subjectivities and an egalitarian world.

Conclusion

In conclusion, it is evident that language and power in political context is quite a complex issue. Being an effective means of precise communication and persuasion, language becomes a particularly influential weapon through which those in power promote specific messages and maintain control. Political actors use language and frequently engage in the use of euphemisms, hyperbole, inflammatory expressions and words, and the use of sets of words that are designed to favor their end of an argument and policies, gain public support, and exclude any form of opposition. This manipulation does not only have the influence of rhetoric but also facts are manipulated and also propaganda is put into circulation either to incite people or even justify despotic practices which are unlawful. I argued that language therefore serves a key part in supporting power relations and in governing political processes and forms.

Furthermore, discourse is central to preserving power and producing unjust relations since power relations within discourse are reflective of power in society. The language of the power and other authoritative agents continuously validates the status quo and increases the focus on the stigma attached to subordinate positions and groups, thereby constituting social hierarchies. Terms such as "illegal aliens" or "terrorists" contain associations that isolate and demonize, which in turn, certifies subjugation of certain groups. When the dominant group directs the conversation while not allowing the oppressed and disadvantaged groups a chance to interject, then the ruling party achieves the best results of maintaining its authority. Such exclusion in discursive practice furthers the political isolation and alienation of given groups, and affirms the role of language within special formative sociopolitical relations. However, it is also worth noting that power is present in politics and the will of the people, Language is also used as a space of struggle and counter-discourse, where minority groups as well as political dissidents can seek agency in overturning dominant narratives and framing movements for progressive change.

As counter-histories and messages, satire and symbolism in these groups allow them to challenge and reclaim dominant discourses, problematize dominant paradigms of oppression, and offer Liberationist possibilities of resistance. They reverse authoritative discursive regimes and resist subjugation to oppressive discourses while nurturing unity and coalition. If one pays close attention to the use of language, especially within political spheres, this paper shows that scholars will be in a better place to examine how political power is built, negotiated, and even revolutionized in a bid to create a fair political system. Awareness of this relationship enables a form of political activism that involves a consciousness aimed at changing existing systems and ways of thinking and therefore helps in formulation of constructive opinions about politics.

References

Althusser, L. (1971). Lenin and Philosophy and Other Essays. Monthly Review Press.

Bakhtin, M. M. (1981). The Dialogic Imagination: Four Essays (M. Holquist, Ed.; C. Emerson & M. Holquist, Trans.). University of Texas Press.
Bourdieu, P. (1991). Language and Symbolic Power. Harvard University Press.
Chilton, P. (2004). Analysing Political Discourse: Theory and Practice. Routledge.
Delgado, R., & Stefancic, J. (2012). Critical Race Theory: An Introduction (2nd ed.). New York University Press.
Edelman, M. (1977). Political Language: Words That Succeed and Policies That Fail. Academic Press.
Fairclough, N. (2001). Language and Power (2nd ed.). Longman.
Habermas, J. (1984). The Theory of Communicative Action: Reason and the Rationalization of Society (Vol. 1). Beacon Press.
Herman, E. S., & Chomsky, N. (1988). Manufacturing Consent: The Political Economy of the Mass Media. Pantheon Books.
Hooks, b. (1994). Teaching to Transgress: Education as the Practice of Freedom. Routledge.
Hutcheon, L. (1994). Irony's Edge: The Theory and Politics of Irony. Routledge
Lakoff, G. (2004). Don't Think of an Elephant!: Know Your Values and Frame the Debate. Chelsea Green Publishing.
Lakoff, G., & Johnson, M. (1980). Metaphors We Live By. University of Chicago Press.
Lutz, W. (1987). Doublespeak: From Revenue Enhancement to Terminal Living: How Government, Business, Advertisers, and Others Use Language to Deceive You. Harper & Row.
Tuchman, G. (1978). Making News: A Study in the Construction of Reality. Free Press.
Van Dijk, T. A. (1998). Ideology: A Multidisciplinary Approach. Sage Publications.